بسم اللہ الرحمن الرحیم

شیعہ علمی رسوم میں آزادیٔ رائے اور بحث مباحثہ کی آزادی

اقتباس از:

امام جعفر صادق علیہ السلام

اور

سائنسی انکشافات

۲۵ عالمی دانشوروں کی تحقیقات کا مجموعہ

پبلشر: موسسہ اہلبیت علیہ السلام پاکستان

پیشکش: سید جہانزیب عابدی و اہلبیت

شیعی ثقافت میں بحث و مباحثہ کی آزادی

امام جعفر صادقؑ کا مکتبِ فکر دیگر تمام مکاتبِ فکر سے اس لئے بھی ممتاز تھا کہ اس میں بحث کی کھلی آزادی تھی اور اسی خصوصیت کے باعث اسے وسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔

ہم گزشتہ صفحات میں یہ بتا چکے ہیں کہ کیتھولک مذہب ایک ہزار سال تک جامد رہا اور آرتھوڈکس فرقہ اب بھی دوسری صدی عیسوی کے افکار و ثقافت کا پابند ہے۔

لیکن شیعی ثقافت کو امام جعفر صادقؑ نے اس طرح تشکیل دیا کہ ابھی دوسری صدی ہجری کا اختتام بھی نہ ہوا تھا کہ اس مذہب نے پھیلنا شروع کردیا، شیعی ثقافت نے صرف ترقی ہی نہیں کی بلکہ وہ دیگر تمام اسلامی فرقوں کے لئے ایک نمونہ بنا تاکہ وہ بھی اپنے عقائد میں بحث و مباحثہ کی گنجائش پیدا کریں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مذہب میں بحث و مباحثہ کی آزادی اسکندریہ کے علمی مکتب سے شروع ہوئی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اسکندریہ کے علمی مکتب میں فلسفہ پر آزاد بحث ہوا کرتی تھی نہ کہ مذہب پر۔ یہ علمی مکتب ساتویں صدی عیسوی تک قائم رہا اور عربوں کے مصر پر حملہ کے بعد غارت ہو گیا۔

اسکندریہ کے علمی مکتب میں فلسفہ کے بعد نجوم، طب، دواسازی، فزکس، کیمسٹری اور کسی قدر میکانکی علوم (MECHANICS) میں دلچسپی لی جاتی تھی لیکن مذہب سے

ان کی دلچسپیاں وابستہ نہ تھیں۔

اسکندریہ کے علمی مکتب کے بعض دانش مند یہودی یا عیسائی تھے لیکن وہ مذہبی مسائل کو علمی بحثوں میں نہیں لاتے تھے۔ کیونکہ یہ علمی مکتب لا دینیت کے لئے مشہور تھا۔ اور اسی لئے اس میں مذہبی مسائل زیرِ بحث نہیں آتے تھے۔

سب جانتے ہیں کہ اسکندریہ کا علمی مکتب اس کتب خانے کے قیام سے عمل میں آیا اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس کتب خانہ کو مصر کے بادشاہ "بطلیموس اوّل" نے تعمیر کرایا تھا۔ جس کی سن وفات ۳۵۸ قبل مسیح ہے۔

یہ تعارف بھی محتاجِ تفصیل نہیں کہ مصر پر ڈھائی صدیوں تک حکومت کرنے والے سلسلہِ بطالسہ کے بادشاہ جن کا پہلا حکمران "بطلیموس اوّل" تھا۔ نسلی اعتبار سے یونانی تھے اور یونان کے خداؤں کی پرستش کرتے تھے لیکن بادشاہ ہونے کے باوجود ان کا مذہبی عقیدہ مکتبِ اسکندریہ کے علمی مباحث میں داخل نہ ہو سکا۔اس علمی مکتب کا پہلا فارغ التحصیل دانش مند شکاک "پیرون" تھا۔

پیرون مستقل طور پر اسکندریہ کا رہنے والا نہ تھا لیکن وہ اس علمی مکتب کا تربیت یافتہ ضرور تھا۔ اور اس مکتب کی تاثیر نے اسے بری طرح شکی بنا دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ دنیا میں کسی حقیقت کا وجود محال ہے اس لئے کہ ایسا کوئی نظریہ نہیں جو کسی اور نظریہ سے رد نہ ہوتا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ پیرون کو مکتبِ اسکندریہ نے شکی نہیں بنایا تھا بلکہ یہ کیفیت اس میں فطری طور پر موجود تھی لیکن اس مکتب میں علمی بحث و مباحثہ کی آزاد فضا نے اس کی اس کیفیت کو ابھارا اور تقویت دی یہاں تک کہ وہ پورے طور پر حقیقت کا منکر بنا۔ اگر سلسلہ بطالسہ کے مصری بادشاہوں کا دین اسکندریہ کے علمی مکتب میں سرائیت کرتا تو پیرون اتنی آسانی کے ساتھ ہر حقیقت کی تردید نہیں کر سکتا تھا کیونکہ بطالسہ کے بادشاہوں کے مذہب میں یونانی خداؤں کا وجود ناقابلِ تردید تھا۔

اس مقام پر ہم پیرون کے فلسفہ پر بحث کرنا نہیں چاہتے کیونکہ یہ عمل ہمیں اصل

موضوع سے دور لے جائے گا۔ ہمارا مدعا صرف یہ بتانا ہے کہ اسکندریہ کے علمی مکتب میں مذہبی امور پر گفتگو نہیں ہوتی تھی کیونکہ یہ مکتب علمی مباحث کے اعتبار سے لادین تھا۔

مذہبی مسائل پر بحث کی آزادی کا آغاز اس وقت ہوا جب امام جعفر صادقؑ نے شیعی ثقافت کی بنیاد ڈالی۔ اس مکتبِ فکر میں مذہبی مباحث، علمی مباحث میں شامل ہونے لگے اور اس کے بعد اس کا جز بن گئے۔ اس کے بعد کی صدیوں میں شیعہ علماء نے اس مذہب کو علمی قوانین سے ثابت کیا اور یہ روش آج بھی جاری ہے۔

شیعہ مذہب کی اس جدّت کو بعد میں دوسرے مذاہب نے بھی اپنایا اور انہوں نے بھی اپنے مذاہب کی حقانیت کو علمی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔

یہ بات سب پر واضح ہے کہ کسی مذہب نے اپنی سچائی کے لئے اپنے آغاز ہی سے علمی دلائل کو پیش نظر نہیں رکھا۔ دینِ اسلام بھی آغاز میں دینِ مسیح اور دینِ موسیٰؑ کی طرح علمی دلائل پر متکی نہ تھا۔ اور آج جب کہ دینِ موسیٰؑ کو ۳۰، دینِ مسیح کو ۲۰ اور دینِ اسلام کو ۱۴ صدیاں بیت چکی ہیں، بیشتر اہلِ نظر کا یہ خیال ہے کہ دین کو علمی استدلال سے کوئی سروکار نہیں بلکہ اس کا تعلق قلب و احساس سے ہے۔

تمام آرتھوڈکس علماء اسی نظریہ کے قائل ہیں۔ اس کے علاوہ کیتھولک علماء کی کثیر تعداد بھی اسی طرزِ فکر کی حامل ہے اور دین کو علم سے الگ رکھنا چاہتی ہے لیکن اس لئے نہیں کہ دین ایک ایسا نظریہ ہے جس کو علم سے ثابت نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس لئے کہ اگر احکامِ دین علمی استدلال سے ثابت نہ بھی ہوں تب بھی ان کے نزدیک دین کی حقانیت پر کوئی آنچ نہیں آتی اس لئے کہ دینِ مسیح کا سرچشمہ عشق ہے نہ کہ علم۔ بالفاظ دیگر اسے عقل سے سروکار نہیں بلکہ عشق اس کا سرچشمۂ حیات ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں کے دینی مدرسوں میں صدیوں تک علوم کی تدریس نہیں ہوتی تھی کیونکہ ان کے عقیدے میں دین کا مصدر علم نہیں تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں کلاسیکی مواد کے علاوہ مذہبی تعلیمات اور مسیحی فقہ کو بھی دستور یا

قانون کے نام سے دروس میں شامل کر لیا گیا اور یہ سلسلہ آج بھی ان مدارس میں خاص طور سے کیتھولک تعلیم گاہوں میں رائج ہے۔

پس عیسائیوں کے دینی مدرسوں میں جس علم کی تدریس ہوتی تھی اس کا تعلق فقط قانون یا مذہبی حقوق سے تھا۔ فزکس' کیمسٹری' نجوم' ہندسہ' طب 'میکانکی علوم (MECHANICS) کے لئے ان مدرسوں کے دروازے پورے قرونِ وسطیٰ میں بند تھے۔ اس کے علاوہ وہاں فلسفہ کی تعلیم بھی ممنوع تھی کیونکہ وہ لوگ ان علوم کو ضرر رساں جانتے تھے۔

امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ وہ پہلا مذہبی مکتب تھا جس میں فلسفہ کے ساتھ ساتھ ان دیگر علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ امام جعفر صادقؑ خود ان علوم کی تدریس فرماتے تھے۔ حالانکہ ابھی عربی زبان میں یونانی حکماء کی کتابوں کے ترجموں نے اتنی وسعت حاصل نہیں کی تھی۔

اس بات کا قوی احتمال ہے کہ یونانی حکماء کے فلسفی نظریات بھی بعض قبطی دانشوروں کے ذریعہ مصر کے راستے مدینہ اور پھر امام جعفر صادقؑ تک پہنچے ہوں۔ یہ قبطی دانشور مکتبِ اسکندریہ میں آزاد بحث کے پیروکار (حامی) تھے۔ اور یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ تمام قبطی پیشواؤں کو فلسفہ سے دلچسپی نہیں تھی۔

وہ تمام کے تمام عیسائی آرتھوڈکس فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کے نزدیک فلسفہ ایک ضرر رساں علم تھا۔

بہرحال فلسفہ سے دلچسپی رکھنے والے قبطی علماء کی تعداد بہت مختصر تھی پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلسفہ ان ہی کے توسط سے مدینہ پہنچا ہوگا۔ اسلام میں امام جعفر صادقؑ سے قبل کسی مدرّس نے اس کو اپنا موضوعِ درس نہیں بنایا اور یہ جو آج ہم شیعہ مدارس اور دیگر اسلامی فرقوں میں اس کا زور دیکھ رہے ہیں یہ اسی ابتکار کا نتیجہ ہے جسے امام جعفر صادقؑ نے صدیوں پہلے عملی جامہ پہنایا تھا۔

امام جعفر صادقؑ کے فلسفی مباحث' افلاطون اور ارسطو کے نظریات ہوا کرتے تھے

اور چونکہ آپؑ نے تدریسِ فلسفہ کی بنیاد ڈالی اس لئے بعد کے ادوار میں شیعہ مدارس نے اس علم کو اپنے طرزِ تعلیم میں شامل کر لیا۔

اسلام کے دوسرے فرقوں میں فلسفہ کی تعلیم شاذ و نادر ہی مشاہدہ میں آتی ہے۔ اور یہی وہ موضوع ہے جو یہ بتاتا ہے کہ فلسفہ کی وابستگی شیعی مکتبِ فکر کے ساتھ رہی ہے اور علاوہ شیعہ مکتبِ فکر کے، اب بھی بعض اسلامی فرقوں میں اس موضوع کو بے کار، ناقابلِ توجہ اور مذہب کے اعتبار سے بے اثر سمجھا جاتا ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ امام جعفر صادقؑ نے عرفان کو بھی اپنا موضوعِ درس بنایا۔ آپؑ کا عرفان مکتبِ اسکندریہ اور مشرق کے عرفان سے وابستہ تھا۔ آپؑ نے ان دونوں کی مدد سے ایک نیا عرفانی مکتب قائم کیا جس کو آپؑ کے ماننے والوں نے جعفری عرفان کا نام دیا۔ جعفری عرفان کا مشرق اور اسکندریہ کے عرفان سے تقابل یہ واضح کرتا ہے کہ جعفری عرفان نے تزکیۂ نفس اور اخلاقی امور کی طرح دنیاوی امور کو بھی قابلِ توجہ قرار دیا ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے خاص طور پر اخروی امور پر ہی تکیہ نہیں کیا بلکہ آپؑ نے دنیوی امور، اخلاق اور تزکیۂ نفس پر زیادہ زور دیا۔ گویا آپؑ یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ جو ان امور میں کوشاں رہا آخرت میں اچھی جزا کا حق دار ہے اور یہ دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے جو کچھ اس میں بویا جائے گا آخرت میں وہی کاٹا جائے گا۔ وہ لوگ جو اس دنیا میں اپنی دنیوی اور اخروی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہیں انہیں دوسری دنیا میں اپنے انجام سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے اور یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ انہوں نے آخرت کے لئے کوئی توشہ فراہم نہیں کیا ہے۔

امام جعفر صادقؑ کا عرفان دوسرے مکاتبِ فکر میں پائی جانے والی مبالغہ آرائیوں سے یکسر پاک ہے۔ جس میں خالق و مخلوق کی وحدت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔

آپؑ کے عرفان میں انسان اگر نیکوکار ہو گا تو موت کے بعد خدا سے قریب ضرور ہو گا مگر اس سے ملحق نہیں ہو گا۔ کیونکہ مخلوق خالق سے ملحق نہیں ہو سکتی اور جو فاصلہ

مخلوق کو خالق سے جدا کرتا ہے وہ کم ہو سکتا ہے لیکن ختم ہرگز نہیں ہو سکتا۔

امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ ہر طرح کی بحث کی پابندیوں سے آزاد تھی۔ اس میں شاگرد کو کھلی آزادی تھی کہ وہ اپنے استاد پر نکتہ چینی کرے اور اگر ہو سکے تو اس کے نظریہ کی تردید بھی کرے۔ امام جعفر صادقؑ اپنے نظریہ کو اپنے شاگردوں پر مسلط نہیں کرتے تھے بلکہ وہ انہیں آزاد چھوڑ دیتے تھے کہ اگر ان کا دل چاہے تو وہ اسے قبول کریں وگرنہ رد کرنے میں کوئی روک ٹوک یا قباحت نہ تھی۔

آپؑ کے نظریہ کی تصدیق اور قبولیت کا ایک سبب آپؑ کے درس کی تاثیر تھی۔ جو لوگ آپؑ کی درس گاہ میں شرف یاب ہوئے تھے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپؑ سے وابستہ ہو کر انہیں کوئی مادی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک عرصے تک اگر کوئی مدینے سے باہر اپنے آپ کو امام جعفر صادقؑ کا گرویدہ ظاہر کرتا تھا تو بس اس کی جان خطرے میں ہوتی تھی کیونکہ امّوی حکام انہیں دشمن کی نگاہ سے دیکھتے تھے حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان میں مخالفت کی طاقت نہیں ہے۔ مگر چونکہ وہ انہیں دشمن گردانتے تھے اس لئے انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ فرصت ملتے ہی وہ اپنی دشمنی کا اظہار کریں گے۔

آپؑ کے شاگردوں کو ان باتوں کا علم تھا کہ ان کے لئے ترقی کی راہیں مسدود ہیں کیونکہ امام جعفر صادقؑ امّوی حکام کی طرح کسی دنیاوی منصب کے حامل نہیں تھے جس کے ذریعے وہ اپنے شاگردوں اور چاہنے والوں کو کوئی مقام عطا کر سکیں۔

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ امام جعفر صادقؑ کے پاس اتنی دولت بھی نہیں ہے کہ وہ اپنی جیبِ خاص سے ان کی مدد کر سکیں۔ اس کے باوجود جو چیز انہیں آپؑ کی درس گاہ کی طرف کھینچ لاتی تھی وہ آپؑ کی قوتِ کلام اور اس کلام پر آپؑ کا ایمان تھا اور کیونکہ امام جعفر صادقؑ کو اپنی بات پر بھروسہ اور یقین تھا اس لئے آپؑ کی بات آپؑ کے شاگردوں پر مؤثر واقع ہوتی تھی۔

آپؑ اپنی طرزِ حیات میں اس ڈگر پر نہیں چلتے تھے جسے سولہویں صدی عیسوی کے

بعد سے "یوتوپیا" کا نام دیا گیا۔ (ا)

امام جعفر صادقؑ اپنے شاگردوں کو کسی ایسے آئیڈیل نظام سے روشناس نہیں فرماتے تھے جو تصوّراتی حد تک محدود ہو اور اسے عملی صورت نہ دی جا سکے۔

آپؑ کے پدرِ گرامی امام محمد باقرؑ کے زمانے میں جو شاگرد ان کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے یہ توقع رکھتے تھے کہ انہیں دنیوی مقام حاصل ہو اور وہ قاضی کے عہدوں پر فائز ہوں ۔ کیونکہ اموّی خلیفہ ولید بن عبدالمالک نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ وہ امام محمد باقرؑ کی درس گاہ سے فارغ التحصیل افراد میں سے کچھ کو منصبِ قضاوت کے لئے انتخاب کرے گا۔

لیکن امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ میں تعلیم پانے والے افراد کے لئے ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اور وہ صرف کسبِ معرفت کے لئے علم حاصل کر رہے تھے۔

مصر پر عربوں کے حملے اور اسکندریہ کی تباہی سے پہلے مکتبِ اسکندریہ اور امام جعفر صادقؑ کا مکتب دونوں بحث و مباحثہ کی آزادی کے قائل تھے لیکن ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ مکتبِ اسکندریہ مذہبی بحث و مباحثہ کی اجازت نہیں دیتا تھا لیکن امام جعفر صادقؑ کے درس میں مذہب پر بھی گفتگو ہوتی تھی اور شاگردوں کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ استاد کے نظریہ پر اعتراض کریں۔

بحث و مباحثہ کی اسی آزادی نے شیعی مکتبِ فکر کو فروغ دیا کیونکہ اس میں جبراً کوئی

ا۔ یوتوپیا دو یونانی جملوں (یو) یعنی نہیں یا (لا) اور "توپیا" یعنی مکان کا مرکب ہے اور اصطلاحاً یہ ایک تصوّراتی ملک کا نام ہے جو ایک آئیڈیل (لیکن غیر عملی اور تصوّراتی) نظام کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ یوتوپی ایک کتاب کا نام بھی ہے۔ جسے انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم کے صدرِ اعظم "تھامس قدر" نے پندرھویں صدی عیسوی کے نیمۂ دوم میں لکھا جس میں سوسائٹی پر گفتگو کی گئی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ "تمام افراد معاشی یا مادی بضاعت کے اعتبار سے برابر ہیں۔" "تھامس مور" نے ۱۵۳۵ء میں سزائے موت پائی اور جس وقت اس کا سر تبر سے جدا کیا گیا اس وقت اس کی عمر ۹۵ سال تھی ۔ (فارسی مترجم)

بات منوائی نہیں جاتی تھی بلکہ ماننے والا باطنی میلان سے اس کو قبول کرتا تھا۔ اس آزادیٔ فکر و نظر نے لوگوں کو اپنی طرف جذب کیا اور لوگ مادی فائدے کو بالائے طاق رکھ کر صمیمِ قلب کے ساتھ اس طرزِ فکر اور پھر شیعہ مذہب کے گرویدہ ہو گئے۔

مشرق کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ صفوی خاندان سے قبل مشرقی ممالک میں شیعہ حکومتیں یا ایسی حکومت جس کا سربراہ شیعہ ہو بہت ہی کم تھیں جن میں آلِ بویہ کا خاندان شامل ہے اگرچہ سلاطینِ آلِ بویہ نے شیعہ مذہب کو پھیلانے کے لئے اقدامات کئے مگر ان کے اقدامات نے جبر کی راہ اختیار نہیں کی بلکہ یہ کام شیعی ثقافت سے استفادہ کرتے ہوئے عمل میں آیا جس کا ایک جزو محرم ۶۱ ہجری کے واقعاتِ کربلا بھی ہیں۔ آلِ بویہ کے بعد مشرقی ممالک میں شیعہ سلاطین کی کوئی مستقل حکومت نظر نہیں آتی۔ سوائے اس موقع کے کہ جب صفوی خاندان نے اقتدار سنبھالا۔

شیعہ اقتدار کی اس قلیل سی مدت کو ایک طرف رکھ کر دیکھا جائے تو یہ مذہب حکومتوں کی سخت مخالفتوں کے باوجود پھیلتا رہا اگرچہ اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی لیکن کیونکہ اس کے پاس ایک محکم، بسیط اور ناقابلِ شکست سرمایہ تھا اس لئے وہ سینکڑوں سال جابر حکمرانوں اور شیعہ دشمن حکام کے مقابل مضبوطی کے ساتھ قائم رہا حالانکہ حکومت کی سرپرستی حاصل نہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مادی اعتبار سے بھی کمزور اور بے سہارا تھا۔

بعض اقوام ایسی بھی تھیں جنہوں نے اقتدار میں آئے بغیر صدیوں زندگی گزاری اور مخالفتوں کا شکار بھی رہیں البتہ ان کی مادی حالت بڑی مستحکم تھی۔ مثلاً یورپ میں آباد قرون وسطیٰ کے یہودی جن سے نہ صرف یہ کہ عام انسان بلکہ حکام یہاں تک کہ بعض سلاطین بھی قرض لیا کرتے تھے اور چونکہ وہ مادی اعتبار سے ان کی احتیاج پوری کیا کرتے تھے لہٰذا انہیں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا سکتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے یہودیوں کا طرزِ زندگی وہاں کے عیسائیوں سے مختلف نہ تھا مگر یہ کہ یورپ کے بعض

شہروں میں ان کے رہنے کے لئے ایک جداگانہ مقام معین تھا۔

امام جعفر صادقؑ کے ہزار سال بعد جب یورپ کو قرونِ وسطیٰ کے اندھیروں سے نجات ملی اور لوگوں کے افکار میں بالیدگی پیدا ہوئی تو اس وقت بھی فرانس، اٹلی، اسپین اور پرتگال جیسے یورپی ممالک میں اگر کوئی شخص کیتھولک مذہب کے فروعی مسائل پر بھی معمولی سا اعتراض کرتا تو اسے سخت ترین سزاؤں سے دوچار ہونا پڑتا، چہ جائے کہ کوئی اصول پر اعتراض کرے۔

اٹلی کے پادری "برونو" نے کیا کہا تھا جسے زندہ جلا دیا گیا؟

"برونو" ۱۶۰۰ عیسوی میں کہ جس کے بعد سترہویں صدی شروع ہوتی ہے ایک ایسی بات پر زندہ جلا دیا گیا جس کا تعلق کسی بھی لحاظ سے کیتھولک مذہب کے نہ اصول سے تھا اور نہ فروع سے۔

"برونو" نے کہا تھا کہ "ہر شخص عقلی بلوغ میں داخل ہونے کے بعد دنیا اور زندگی کے بارے میں اپنی عقل اور استنباط کے مطابق ایک عقیدہ کا قائل ہو جاتا ہے۔"

بس اسی معمولی سے نظریے نے "برونو" کو زندہ جلوا دیا۔

جس وقت اسے جلایا گیا اس کی عمر ۵۲ سال تھی۔ تمام عمر اس کا کام محتاجوں اور بیواؤں کی امداد اور ان کی دستگیری تھا۔ وہ مفلس اور تنگ دست مریضوں کے لئے علاج و معالجہ کے وسائل بھی فراہم کرتا تھا۔ جس طرح چیونٹی اس بات سے خوش ہوتی ہے کہ وہ اپنی خوراک دوسرے کو دے دے اور خود بھوکی رہے اسی طرح "جیورنے انو برونو" کو بھی اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال کر دوسروں کو سکھ پہنچانے سے خوشی حاصل ہوتی تھی۔

پادری کا مقام حاصل کرنے کے بعد سے قید میں ڈالے جانے تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی ضرورت مند اس کے پاس آئے اور ناامید واپس جائے۔ وہ جہاں کہیں رہتا اس کے گھر کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا۔ رات کے وقت بھی اس کا دروازہ بند نہیں ہوتا تھا۔ شب کے کسی حصے میں کوئی حاجت مند اس کے پاس آتا تو وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا اور اپنی

استعداد کے مطابق اس کی حاجت روائی کرتا تھا۔

جس روز ونز کے بڑے میدان میں اسے جلایا جا رہا تھا اس وقت مسلح سپاہیوں کی بڑی تعداد اس بات پر مامور تھی کہ لوگوں کے اژدھام کو آگے بڑھنے سے روکے اور انہیں "برونو" تک نہ پہنچنے دے۔ جب "برونو" کو اس میدان میں لا کر لکڑیوں کے ڈھیر کے درمیان واقع ایک ستون سے باندھا گیا تو یہ منظر دیکھ کر تمام مجمع رونے لگا۔ جلّاد نے تیل سے بھیگی ہوئی لکڑیوں کے قریب مشعل رکھ دی اور محتاجوں اور درد مندوں کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے والا انسان ہولناک چیخوں کے ساتھ نذر آتش ہو گیا۔ فضا جلے ہوئے گوشت کی بدبو سے بھر گئی اور "برونو" کی عمر بھر کی نیکیاں بھی اسے اس دردناک موت سے نہ بچا سکیں۔

آج "برونو" کی کہی ہوئی بات کی حقیقت سب پر عیاں ہے اور ہم اسے منطقی اور قابلِ قبول سمجھتے ہیں۔ لیکن سولہویں صدی عیسوی کے اواخر میں محکمۂ تفتیشِ عقیدہ نے اس کی اس بات کو مسیحی مذہب کی مخالفت پر محمول کیا اور یہ فیصلہ دیا کہ ہر عیسائی کے لئے ضروری ہے کہ وہ عقلی بلوغ میں داخل ہونے کے بعد دنیا کو اسی طرح سمجھے اور وہی عقیدہ رکھے جسے مقدّس کتاب (عہدِ عتیق) اور (عہدِ جدید) نے لکھا ہے اور اپنی عقل اور استنباط کو اس میں دخل نہ دے۔ اور چونکہ "برونو" نے کہا ہے کہ "انسان" دنیا کے بارے میں اپنی عقل و استنباط کے مطابق فیصلہ کرتا ہے لہٰذا وہ مرتد ہے اور اس کے ارتداد کا سبب یہ ہے کہ شیطان نے اس میں حلول کیا ہے اب اس کو جلا دیا جانا چاہئے تاکہ شیطان اس کے بدن سے خارج ہو جائے۔

لیکن شیعہ مکتبِ فکر میں گوناگوں مسائل پر مباحثہ کی اتنی آزادی تھی کہ تیسری صدی ہجری کے نیمۂ اوّل میں ابنِ راوندی جیسا شخص دنیائے اسلام میں ظاہر ہوا۔

---☆---☆---

التماس سورہ فاتحہ برائے بلندی درجات مرحومین

سید سرکار حیدر عابدی ابن سید صغیر حسین عابدی
شہید سید عنایت رضا رضوی ابن سید عنایت حسین رضوی
شہید سید عمران علی رضوی ابن سید ہادی علی رضوی
آیت اللہ العظمٰی سید ابن حسن نجفی ابن سید مہدی حسین
آیت اللہ العظمٰی سید مرتضی حسین نقوی صدر الافاضل ابن
مولانا سید سردار حسین نقوی
ثقۃ الاسلام طلعت سیدہ جعفری بنت سید حسن مثنی
سید صغیر حسین عابدی ابن میر مخدوم علی
سیدہ اقبال بیگم بنت میر مطلوب حسین
سید عنایت حسین رضوی ابن سید ثروت حسین رضوی
سید ساجد حسین رضوی ابن سید سجاد حسین رضوی
سیدہ اقبال جہاں بنت سید فدا حسین رضوی
سیدہ افسر جہاں بنتِ سید جواد حسین
سید تنویر السلام زیدی ابن سید اقبال حسین زیدی
سید ہادی علی رضوی ابن سید صادق علی رضوی
سیدہ عشرت جہاں عابدی بنت سید صغیر حسین عابدی
سید امین الحسن عابدی ابن سید علی حسین عابدی
سیدہ سکندر جہاں عابدی بنت سید صغیر حسین عابدی
سید کاظم علی زیدی ابن سید عابد علی زیدی
سید مظہر حسین عابدی ابن سید صغیر حسین عابدی

رضوانہ شمیم بنت شاہ ہادی عطا

مرزا وصی حیدر ابن مرزا محمد حیدر

سیدہ شمس آرا بیگم بنت سید محمد تقی زیدی

سید ظہور الحسن ابن سید سرفراز حسین

شاہجہان بیگم بنت محمد عباس

سیدہ صالحہ رضوی بنت سید سرفراز حسین رضوی

سید جلال حیدر جعفری ابن سید علی صغیر جعفری

سیدہ کنیز فاطمہ عابدی بنت سید ارتضاء جعفری

سید سعید حیدر رضوی ابن سید رئیس حیدر رضوی

سید علی کاظم جعفری ابن سید آل رضا جعفری

سید حسین عاصم جعفری ابن آل رضا جعفری

سید ہاشم جعفری ابن سید آل رضا جعفری

زینب صغریٰ بنت حسین احمد

سید حامد علی نقوی ابن سید ولی حیدر نقوی

سید شرافت علی نقوی ابن سید شجاعت علی نقوی

سیدہ شفیق زہرا بنتِ سید ممتاز حسین

سید قاسم رضا رضوی ابن سید علی مہدی

سیدہ جمال فاطمہ بنتِ سید شاہد حسین زیدی

سید فدا حسین رضوی ابن سید واجد حسین رضوی

سید فدا عباس رضوی ابن سید فدا حسین رضوی

سید فدا اصغر رضوی ابن سید فدا حسین رضوی

سید فدا اکبر رضوی ابن سید فدا حسین رضوی

محمد افضل حیدر ابن عبد الرشید
رئیس حیدر ابن محمد حیدر
محمد اجمل ابن محمد حیدر
محترمہ احسن جہاں بنتِ علی سجاد
سکندر عالم ابن جعفر حسین
علی حسنین ابن عارف حسین
آسیہ بیگم بنت سید کفایت علی نقوی

اپنی دعاؤں میں ان مرحومین کو بھی یاد رکھیں
جن کے لواحقین موجود نہیں اور کوئی ان کیلئے
دعا کرنے والا نہیں ہے۔